QUARTERLY, PEER REVIEWED
al-amir
ISSN(P): 2790-931X ISSN(E): 2790-9328
E-Mail: editor.alamir@gmail.com

تعلیم یافتہ طبقے میں صنفی عصبیت اور عورت مخالف رویّے کے نفسیاتی محرکات: فکری ادراک اور تعلیمی تناظر میں ایک جائزہ

Psychological Determinants of Gender Bias and Anti-Women Attitudes among the Educated Class: An Analysis in Cognitive and Educational Contexts

Almas Ilyas
M.Phil. Scholar, Department of Islamic Studies, Riphah International University Faisalabad, Pakistan *Email:* almasilyas333@gmail.com

Muhammad Farooq Haider Yasin
Lecturer in Islamic Studies, Govt. Graduate College Abdul Hakim, Khanewal, Pakistan *Email:* fhaider867@gmail.com

Imran Ali
Lecturer in Islamic Studies, Govt. Graduate College Toba Tek Singh, Pakistan *Email:* www.saalic.edu.pk@gmail.com

Submission Date:
01 September 2026
Review Date:
06 September 2026
Acceptance Date:
18 September 2026
Publication Date:
27 September 2026

Article Link:
https://alamir.com.pk/index.php/ojs/article/view/365

Abstract

Gender bias and anti-women attitudes continue to persist among educated individuals despite increasing awareness of gender equality and human rights. This study examines the psychological determinants of gender bias and anti-women attitudes among the educated class, with particular focus on perception and educational level. The research employs a qualitative, analytical, and exploratory methodology based on relevant psychological, sociological, and contemporary academic literature.

The study explores the role of cognitive perceptions, socialization, cultural norms, gender stereotypes, traditional gender roles, and patriarchal attitudes in shaping negative perceptions of women. It also examines the relationship between educational level and attitudes toward gender equality, women's rights, and social participation. The study highlights that formal education alone may not eliminate deeply rooted gender prejudice unless it is accompanied by critical thinking, social awareness, ethical development, and respect for human dignity.

The study concludes that gender bias is a multidimensional phenomenon influenced by psychological, social, cultural, and educational factors. Addressing anti-women attitudes therefore requires comprehensive educational and social strategies that promote equality, empathy, critical awareness, and respect for women, contributing to a more inclusive and equitable society.

Keywords: Gender Bias, Anti-Women Attitudes, Educated Class, Psychological Determinants, Perception, Educational Level, Gender Stereotypes, Gender Equality.

تمہید:

انسانی معاشرے کی تشکیل اور ترقی میں تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ تعلیم انسان کے شعور کو وسعت دینے، فکری صلاحیتوں کو نکھارنے، اخلاقی اقدار کو فروغ دینے اور معاشرتی رویّوں میں مثبت تبدیلی پیدا کرنے کا اہم ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ بالخصوص جدید دور میں تعلیم کو مساوات، انسانی حقوق، سماجی انصاف اور انسانی وقار کے فروغ کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ اس توقع کے باوجود یہ حقیقت قابلِ توجہ ہے کہ رسمی تعلیم اور اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کرنے کے بعد بھی بعض افراد کے رویّوں میں صنفی تعصبات، عورت کے بارے میں منفی تصورات اور امتیازی رویّے برقرار رہتے ہیں۔ یہی صورتِ حال تعلیم اور عملی سماجی رویّوں کے درمیان ایک اہم سوال پیدا کرتی ہے۔

صنفی عصبیت سے مراد کسی فرد کے ساتھ اس کی جنس کی بنیاد پر غیر مساوی، متعصبانہ یا امتیازی رویہ اختیار کرنا ہے۔ عورت مخالف رویّے اس تعصب کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہو سکتے ہیں، جن میں عورت کی صلاحیتوں کو کم تر سمجھنا، اس کے فیصلوں کو غیر اہم تصور کرنا، اس کے سماجی و پیشہ ورانہ کردار کو محدود کرنا، اس کے حقوق کے بارے میں منفی تصورات رکھنا اور روایتی صنفی کرداروں کو غیر تنقیدی انداز میں قبول کرنا شامل ہیں۔ ایسے رویّے ہمیشہ کھلے امتیاز کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات غیر محسوس نفسیاتی تصورات، دقیانوسی سوچ اور معاشرتی توقعات کے ذریعے فرد کے رویّے کا حصہ بن جاتے ہیں۔

اس تناظر میں ادراک (Perception) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ افراد خواتین کے کردار، صلاحیت، آزادی، حقوق اور معاشرتی مقام کے بارے میں جو تصورات قائم کرتے ہیں، وہ ان کے رویّوں کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ ادراک خاندانی تربیت، ثقافتی اقدار، معاشرتی ماحول، ذاتی تجربات، میڈیا، مذہبی و سماجی تصورات اور صنفی کرداروں سے متاثر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ محض تعلیمی قابلیت کو مثبت اور مساوی صنفی رویّوں کی ضمانت قرار دینا کافی نہیں، بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ تعلیم فرد کے شعور، ادراک اور نفسیاتی ساخت میں کس نوعیت کی تبدیلی پیدا کرتی ہے۔

تعلیمی سطح اور صنفی رویّوں کے باہمی تعلق کا مطالعہ بھی اس حوالے سے اہم ہے۔ عمومی طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم میں اضافے کے ساتھ فرد میں تنقیدی سوچ، برداشت، انسانی حقوق کا شعور اور مساوات کا احساس پیدا ہو گا؛ تاہم مختلف سماجی و ثقافتی عوامل بعض اوقات تعلیم کے باوجود روایتی صنفی تصورات کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ تحقیق اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں صنفی عصبیت اور عورت مخالف رویّے کس حد تک موجود ہیں اور ان کے پسِ پشت کون سے نفسیاتی اور ادراکی عوامل کارفرما ہو سکتے ہیں۔

زیرِ نظر آرٹیکل کا مقصد صنفی عصبیت کو محض ایک سماجی مسئلہ سمجھنے کے بجائے اس کے نفسیاتی، ادراکی اور تعلیمی پہلوؤں کو باہم مربوط کر کے سمجھنا ہے۔ اس تحقیق کے ذریعے یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ افراد کے تصورات، ذہنی رویّے، سماجی تربیت اور تعلیمی سطح کس طرح عورت کے بارے میں ان کے رویّوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس پہلو کا مطالعہ نہ صرف صنفی مساوات کے فروغ کے لیے اہم ہے بلکہ ایسے تعلیمی و سماجی اقدامات کی تشکیل میں بھی معاون ثابت ہو سکتا ہے جو تعصب، دقیانوسی تصورات اور امتیازی رویّوں کے خاتمے اور ایک زیادہ منصفانہ، باوقار اور جامع معاشرے کے قیام میں کردار ادا کریں۔

علمی تکبر اور باطنی اصلاح: امام غزالیؒ کا فکری تناظر

علم اور تعلیم کی قدر کا تعین محض معلومات کے حصول سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے انسانی کردار اور رویّے پر پڑنے والے اثرات سے بھی ہوتا ہے۔ اسلامی اخلاقی روایت میں علم کو تزکیۂ نفس، اخلاقی اصلاح اور انسانی کردار کی بہتری سے جوڑا گیا ہے۔ اس تناظر میں جب علم باطنی اصلاح اور اخلاقی تربیت سے جدا ہو جائے تو اس کے نتیجے میں علم پر غرور، برتری کا احساس اور تکبر پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں علم کے مطلوبہ اثرات کو واضح کرتے ہوئے ایک روایت نقل کی ہے:

"لا تَجْلِسُوا عِنْدَ كُلِّ عَالِمٍ إِلّا إِلَى عَالِمٍ يَدْعُوكُمْ مِنْ خَمْسٍ إِلَى خَمْسٍ: مِنَ الشَّكِّ إِلَى الْيَقِينِ، وَمِنَ الرِّيَاءِ إِلَى الإِخْلَاصِ، وَمِنَ الرَّغْبَةِ إِلَى الزُّهْدِ، وَمِنَ الْكِبْرِ إِلَى التَّوَاضُعِ، وَمِنَ الْعَدَاوَةِ إِلَى النَّصِيحَةِ"[1]

"ہر عالم کے پاس مت بیٹھو۔ صرف ایسے عالم کے پاس بیٹھو جو تمھیں پانچ چیزوں سے ہٹا کر پانچ چیزوں کی طرف بلاتا ہو۔ شک سے یقین کی طرف، ریا سے اخلاص کی طرف، دنیا کی خواہش سے زہد کی طرف، تکبر سے تواضع کی طرف، دشمنی سے خیر خواہی کی طرف۔"

اس روایت میں علم کی قدر کا ایک اہم اخلاقی معیار سامنے آتا ہے کہ حقیقی علم انسان میں تواضع، انکسار اور اصلاحِ کردار پیدا کرتا ہے، نہ کہ خود پسندی اور برتری کا احساس۔ اس اعتبار سے علم اور اخلاق ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ علم کی حقیقی افادیت اس کے عملی اور اخلاقی اثرات سے ظاہر ہوتی ہے۔ علم اور اخلاق کا یہ باہمی تعلق کوئی سطحی بات نہیں، بلکہ اصلاحِ رویّہ کا اصل محور ہے۔ محض اعلیٰ تعلیمی اسناد یا بڑی ڈگریاں اس بات کی ضامن ہرگز نہیں ہو سکتیں کہ فرد نے اپنے اندر فکری وسعت کے ساتھ ساتھ اخلاقی پختگی بھی پیدا کر لی ہے۔

اسی باطنی و علمی تکبر کے دائرے کو مزید واضح کرتے ہوئے امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں عبد اللہ بن المبارکؒ کا یہ قول نقل فرمایا ہے، ابنِ مبارک فرماتے ہیں کہ:

"آدمی جب تک طلب علم میں لگا رہتا ہے، عالم ہوتا ہے اور جہاں یہ خیال گزرا کہ میں عالم ہو گیا اسی لمحہ جاہل ہو جاتا ہے۔"[2]

ابنِ مبارکؒ کے اس قول کی روشنی میں معاصر تعلیمی و معاشرتی رویّوں کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ علم کا حقیقی تقاضا انسان کے اندر عاجزی، وسعتِ نظر اور اپنی فکری حدود کا شعور پیدا کرنا ہے، نہ کہ برتری کا احساس۔ جب کوئی تعلیم یافتہ فرد اپنی سند، ڈگری یا پیشہ ورانہ حیثیت کو فکری برتری کی علامت بنا لیتا ہے تو علم اپنی اخلاقی و اصلاحی روح سے دور ہو جاتا ہے۔

یہی صورتِ حال اس وقت مزید نمایاں ہو جاتی ہے جب علمی برتری کا احساس روایتی مردانہ بالادستی کے تصورات کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ ایسے مرد اپنی ڈگری، علمی حیثیت یا پیشہ ورانہ مقام کو عورت کی رائے، فکری صلاحیت اور خود مختاری کو کم تر سمجھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عورت کی علمی قابلیت کو نظر انداز کرنا، اس کی رائے کو محض صنف کی بنیاد پر غیر اہم قرار دینا، یا اس کی خود مختاری کو اس کی تعلیم کے باوجود ناپسند کرنا اسی علمی و باطنی تکبر کی عملی صورتیں ہیں۔

تعلیمی تضاد اور اخلاقی انحطاط: امام آجریؒ کا فکری موقف

کسی بھی معاشرے میں تعلیم یافتہ طبقے سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے علم و صلاحیت کے مطابق رویوں میں پختگی، تحمل اور اخلاقی اعتدال کا مظاہرہ کرے گا۔ لیکن جب ظاہری ڈگری اور عملی رویوں کے درمیان تضاد پیدا ہو جائے، تو تعلیمی ادراک محض ایک دعوے تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے میں پائے جانے والے علمی ادراک اور عملی رویوں کے تضاد کو سمجھنے کے لیے امام آجریؒ کی فکر سے استدلال کرنا انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی تصنیف اخلاق العلماء میں اس رویاتی اور فکری انحراف کی اصل جڑ کو نمایاں کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"فَهُوَ يَنْسُبُ نَفْسَهُ إِلَى أَنَّهُ مِنَ الْعُلَمَاءِ، وَأَخْلَاقُهُ أَخْلَاقُ أَهْلِ الْجَهْلِ وَالْجَفَاءِ، فِتْنَةٌ لِكُلِّ مَفْتُونٍ، لِسَانُهُ لِسَانُ الْعُلَمَاءِ، وَعَمَلُهُ عَمَلُ السُّفَهَاءِ"[3]

"وہ خود کو علماء (تعلیم یافتہ طبقے) میں شمار تو کرتا ہے، مگر اس کے اخلاق و رویے جاہلوں اور سنگ دلوں جیسے ہوتے ہیں، وہ ہر فتنے میں پڑنے والے کے لیے ایک آفت ہے۔ اس کی زبان تو علماء (دانشوروں) والی ہوتی ہے، مگر اس کا عمل و رویہ کم ظرفوں (سفہاء) والا ہوتا ہے۔"

اس سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ محض تعلیمی اسناد، القابات یا خود کو دانشمند طبقے سے منسوب کر لینا شخصیت کی اخلاقی پختگی اور رویوں کی درستی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ جب تعلیم کا مقصد باطنی اصلاح اور نفسیاتی تربیت کی بجائے صرف ظاہری برتری یا سوسائٹی میں مقام حاصل کرنا بن جائے، تو انسان کی زبان سے تو علمی باتیں نکلتی ہیں لیکن اس کا طرزِ عمل کم ظرفوں اور جاہلوں جیسا ہی رہتا ہے۔

تعلیمی ڈگری اور فکری بصیرت: علم و حکمت کا تفاوت

معاصر تعلیمی ساخت میں معلوماتی اور نصابی صلاحیت کو تو کامیابی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، مگر اس کے ساتھ اخلاقی بصیرت اور رویاتی بالیدگی کا ہونا لازم نہیں ہے۔ اسلامی فکر کے کلاسک روایات میں بھی اس فرق کو انتہائی باریکی سے واضح کیا گیا ہے کہ محض ڈگری اور معلومات کا ذخیرہ انسان کو دانشمند یا صاحبِ اخلاق نہیں بناتا، جب تک کہ اس کے اندر رویوں کا اعتدال اور حکمت پیدا نہ ہو۔ اسی علمی اور اخلاقی تفریق کو نمایاں کرتے ہوئے امام آجریؒ اپنی تصنیف کتاب اخلاق العلماء میں حضرت فضیل بن عیاضؒ کا قول نقل فرماتے ہیں:

"وَقَالَ الْفُضَيْلُ: الْعُلَمَاءُ كَثِيرٌ، وَالْحُكَمَاءُ قَلِيلٌ، وَإِنَّمَا يُرَادُ مِنَ الْعِلْمِ الْحِكْمَةُ، فَمَنْ أُوتِيَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔۔۔قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحُسَيْنِ: قَوْلُ الْفُضَيْلِ - وَاللَّهُ أَعْلَمُ -: الْفُقَهَاءُ كَثِيرٌ، وَالْحُكَمَاءُ قَلِيلٌ. يَعْنِي قَلِيلٌ مِنَ الْعُلَمَاءِ مَنْ صَانَ عِلْمَهُ عَنِ الدُّنْيَا، وَطَلَبَ بِهِ الْآخِرَةَ، وَالْكَثِيرُ مِنَ الْعُلَمَاءِ قَدِ افْتُتِنَ بِعِلْمِهِ، وَالْحُكَمَاءُ قَلِيلٌ، كَأَنَّهُ يَقُولُ: مَا أَعَزَّ مَنْ طَلَبَ بِعِلْمِهِ الْآخِرَةَ"[4]

"اور فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا: علماء (معلومات و اسناد رکھنے والے) تو بہت ہیں، لیکن حکماء (صاحبِ حکمت و اخلاق) تھوڑے ہیں، اور علم سے اصل مقصد تو حکمت حاصل کرنا ہی ہے۔ تو جسے حکمت دے دی گئی اسے بہت بڑی خیر مل گئی۔ محمد بن الحسین (امام آجریؒ) فرماتے ہیں: فضیلؒ کے اس قول کا مطلب واللہ اعلم یہ ہے کہ فقیہ و عالم تو بہت ہیں مگر حکماء کم ہیں یعنی علماء میں سے ایسے لوگ

بہت ہی کم ہیں جنہوں نے اپنے علم کو دنیاوی اغراض سے محفوظ رکھا ہو اور اس کے ذریعے آخرت کی طلب رکھی ہو۔ جب کہ بہت سے علماء اپنے علم کے سبب ہی فتنے اور آزمائش (تکبر و برتری) میں مبتلا ہو گئے، اور حکماء تھوڑے ہی ہیں۔ گویا وہ یہ فرما رہے ہیں کہ اپنے علم کے ذریعے آخرت اور اصلاح کا طالب بننے والا شخص کتنا نایاب ہے"

لہٰذا محض ڈگریاں، معلومات اور تعلیمی اسناد حاصل کر لینا "علم" تو کہلا سکتا ہے، مگر وہ "حکمت" کا متبادل نہیں بن سکتا۔ جب تعلیمی نظام فرد کو معلومات تو دے دے لیکن اس کے اندر روایتی پختگی، عاجزی اور بصیرت پیدا نہ کرے، تو معاشرے میں ڈگری ہولڈرز کی کثرت کے باوجود اخلاقی و نفسیاتی بحران برقرار رہتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے میں صنفِ مخالف یا دیگر محروم طبقات کے خلاف پایا جانے والا منفی رویہ اور تعصب دراصل اسی حکمت و ظرف کی کمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ علم کا حقیقی مقصد انسانی رویوں کی تہذیب ہے نہ کہ صرف نصابی صلاحیت کی نمائش۔ دوسرا یہ کہ علم انسان کے لیے محض زوال کا سبب نہیں بنتا، بلکہ بسا اوقات وہی علم فرد کے لیے ایک "نفسیاتی و اخلاقی فتنہ" (افْتُتِنَ بِعِلْمِهِ) بن جاتا ہے۔ جب تعلیم یافتہ فرد کے پاس ڈگری اور علمی تفوق تو آجائے مگر اخلاقی پختگی نہ ہو، تو اس کا علم اس کے اندر عاجزی کی بجائے خود پسندی، تکبر اور اپنی رائے کی برتری کا زعم پیدا کر دیتا ہے۔

آفۃُ العلم الإعجاب: ابن عبد البر کی روایت میں عُجب کا تصور

علم کا بنیادی مقصد انسان میں تواضع، حلم اور خشیتِ الٰہی پیدا کرنا ہے، جبکہ عُجب (خود پسندی) اور تکبر اس کے بالکل برعکس انسان کو جہلِ مرکب اور ہلاکت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ علمی سفر میں جب طالبِ علم یا عالم اپنے علم پر اترانے لگتا ہے، تو یہی نقطہ اس کے زوال اور معرفت سے محرومی کا آغاز بن جاتا ہے۔ کلاسیکی اسلامی ادبیات اور آثارِ اسلاف میں اس باہمی تضاد کو نہایت دلنشین اور نصیحت آموز انداز میں بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ علی بن ثابت کے اس معروف شعر میں علم اور مال کی آفات کا موازنہ کر کے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے:

"عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: آفَةُ الْعِلْمِ النِّسْيَانُوَقَالَ عَلِيُّ بْنُ ثَابِتٍ:الْعِلْمُ آفَتُهُ الْإِعْجَابُ وَالْغَضَبُ ... وَالْمَالُ آفَتُهُ التَّبْذِيرُ وَالنَّهْبُ"[5]

"عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: علم کی آفت بھول جانا ہے۔ اور علی بن ثابت نے فرمایا: علم کی آفت خود پسندی اور غصہ ہے، اور مال کی آفت فضول خرچی اور لوٹ کھسوٹ ہے۔"

لہٰذا معلوم ہوا کہ علم اور خود پسندی (عُجب) کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، کیونکہ عُجب علم کے لیے صریح ہلاکت کا باعث ہے۔ علم کا اصل ثمرہ انسان کے اندر خشیتِ الٰہی، حلم اور تواضع کا پیدا ہونا ہے، مگر جب طالبِ علم یا عالم کے اندر خود پسندی اور تکبر سرایت کر جاتا ہے تو وہ اپنے نقائص سے غافل ہو کر حق بات قبول کرنے اور مزید تعلّم کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ علی بن ثابت نے اس شعر میں عُجب کے ساتھ غصے کا ذکر کر کے یہ واضح کیا کہ خود پسند انسان علمی اختلاف یا نصیحت کو برداشت نہیں کرتا اور طیش میں آجاتا ہے، یوں عُجب علم کے اخلاقی و روحانی جوہر کو باطل کر دیتا ہے۔ اسلاف کی یہ تنبیہ پڑھے لکھے طبقے میں "ادراک اور ڈگری کے تضاد" پر من و عن صادق آتی ہے، جہاں اعلیٰ اسناد، ڈگریوں اور علمی القابات نے فرد میں آگاہی اور اخلاقی پختگی پیدا کرنے کی بجائے ایک نوع کا "علمی عُجب" اور برتری کا زعم بھر دیا ہے۔ یہی عُجب اور علمی برتری جب نفسیاتی طور پر پختہ ہوتی ہے تو تعلیم یافتہ فرد میں

صنفی عصبیت اور عورت کے خلاف جارحانہ رویوں، غصے اور تحقیر کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ خود پسند انسان اپنے اندر موجود روایتی تعصبات کو بھی علمی جواز دینے لگتا ہے۔

خاندانی نظام میں عدل و توازن: مقاصدِ شریعت کا تقاضا

تعلیم یافتہ طبقے میں ڈگری اور ادراک کا تضاد جب خاندانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، تو رشتوں میں باہمی احترام کی بجائے طاقت کا زعم اور "حاکم و محکوم" کا فکری بگاڑ جنم لیتا ہے۔ اس فکری بگاڑ کا شرعی و مقاصدی حل پیش کرتے ہوئے شیخ الاسلام علامہ محمد الطاہر ابن عاشور اپنی کتاب مقاصد الشریعة الإسلامیة کے باب "المقصد من أحکام العائلة" میں رقمطراز ہیں کہ:

"وَجَاءَتْ شَرِيعَةُ الإِسْلَامِ مُهَيْمِنَةً عَلَى شَرَائِعِ الحَقِّ فَكَانَتِ الأَحْكَامُ الَّتِي شَرَعَتْهَا لِلْعَائِلَةِ أَعْدَلَ الأَحْكَامِ وَأَوْثَقَهَا"[6]

"اور شریعتِ اسلامیہ تمام حق شریعتوں پر نگران و فائق بن کر آئی ہے، چنانچہ اس نے خاندانی نظام کے لیے جو احکام مشروع کیے، وہ تمام احکام میں سب سے زیادہ عادلانہ اور سب سے زیادہ مضبوط ترین ہیں۔"

علامہ ابن عاشورؒ کا یہ جامع بیان اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اسلام کا خاندانی نظام کسی ایک جنس کی جابرانہ حاکمیت یا محض طاقت کے استعمال پر نہیں، بلکہ عدل، توازن اور باہمی ذمہ داریوں پر قائم ہے۔ چنانچہ جب کوئی تعلیم یافتہ شخص اپنی ڈگری یا علمی حیثیت کے زعم میں عورت کو کمتر یا محض محکوم سمجھتا ہے، تو اس کا یہ رویہ شریعت کے قائم کردہ خاندانی عدل کے بنیادی تصور سے متصادم ہو جاتا ہے۔

امام غزالیؒ کی نظر میں علم و عمل کا تضاد: صنفی رویّوں کا نفسیاتی تناظر

انسان کے پاس علم اور ڈگری موجود ہونے کے باوجود جب رویوں میں اصلاح نہیں ہوتی، تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے علم، عقل اور قیاس کے زعم میں مبتلا ہو کر عملی کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ نے امام غزالیؒ کے نقل کردہ نفس کے ساتھ مکالمے کے ذریعے اس نفسیاتی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے کہ:

"اے نفس! ذرا انصاف کر! اگر ایک یہودی تجھ سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں لذیذ ترین کھانا تیرے لیے مضر ہے تو تو صبر کرتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی خاطر تکلیف اٹھاتا ہے، کیا انبیاء کا قول جن کو معجزات کی تائید حاصل ہوتی ہے اور فرمانِ الٰہی اور صحفِ سماوی کا مضمون تیرے لیے اس سے بھی کم اثر رکھتا ہے، جتنا کہ اس یہودی کا ایک قیاس و اندازہ، عقل کی کمی اور کوتاہی کے ساتھ تعجب ہے، اگر ایک بچہ کہتا ہے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے تو بغیر دلیل طلب کیے اور سوچنے سمجھنے اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے، کیا انبیاء، اولیاء اور حکماء کی متفقہ بات تیرے نزدیک اس بچے کی بات سے بھی کم وقعت رکھتی ہے؟"[7]

یہاں سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ علم کا ہونا ایک الگ بات ہے اور اس علم کا ہمارے رویّوں میں ظاہر ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ انسان کبھی ایک معمولی سی بات پر فوراً اپنا عمل بدل لیتا ہے، لیکن جب وہی بات اس کی اپنی انا، پسند یا مفاد کے سامنے آ جائے تو وہ بڑے سے بڑے علم کو بھی آسانی سے نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہی وہ نفسیاتی دھوکا ہے جو انسان کے علم اور اس کے عملی

رویّے کے درمیان ایک بڑا فاصلہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈگری یا اعلیٰ تعلیم اس بات کی ہرگز ضمانت نہیں دیتی کہ انسان کا رویہ بھی اسی قدر اعلیٰ ہوگا۔ ٹھیک یہی معاملہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے صنفی رویّوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

قوامیت کا شرعی و اخلاقی تصور: تفسیر قرطبی کی روشنی میں

خاندانی نظام میں مرد کی سرپرستی اور اس کی اخلاقی و شرعی حدود کی وضاحت کلاسیکی اسلامی لٹریچر کا ایک بنیادی موضوع رہی ہے۔ اس ضمن میں مفسرین نے قرآنی آیات کی روشنی میں مرد کے اختیارات اور اس کے ساتھ عائد ہونے والی اخلاقی ذمہ داریوں کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ امام قرطبیؒ نے سورۃ النساء کی آیتِ قوامیت کی تفسیر میں مرد کو حاصل اختیارات کی حد بندی کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ حاکمیت کا مقصد تسلط قائم کرنا نہیں بلکہ رویے میں عجز اور نرمی اختیار کرنا ہے۔ امام قرطبیؒ رقم طراز ہیں:

> " اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا یہ خاوندوں کو اشارہ ہے کہ نرمی اختیار کریں اور تواضع کا مظاہرہ کریں۔ یعنی اگر تم عورتوں پر قادر ہو تو تم اللہ کی قدرت کو یاد کرو، اس کا دستِ قدرت، ہر ہاتھ سے بلند ہے پس کوئی شخص اپنی بیوی پر بلندی نہ چاہے۔"[8]

معلوم ہوا کہ امام قرطبیؒ کے نزدیک قوامیت کو عورت پر مطلق تسلط یا شخصی برتری کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا، بلکہ مرد کو حاصل ذمہ داری اور اختیار کے ساتھ تواضع، احتیاط اور اللہ کی برتری کا احساس بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ چنانچہ قوامیت کو محض حاکمانہ اختیار سمجھنا اس کے اخلاقی و شرعی تقاضوں کو نظر انداز کرنا ہے۔

فسٹنگر کا نظریۂ معرفتی تضاد: علم و عمل کے درمیان نفسیاتی تفاوت

جدید سماجی نفسیات میں فرد کے علم، اعتقادات اور عملی رویوں کے مابین پیدا ہونے والے تضاد کی وضاحت کے لیے لیون فسٹنگر (Leon Festinger) کا نظریۂ معرفتی تضاد (Cognitive Dissonance Theory) ایک اہم نفسیاتی فریم ورک فراہم کرتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق، جب فرد کے مختلف ادراکات، اعتقادات یا رویّوں میں باہمی عدمِ مطابقت پیدا ہوتی ہے تو اس کے نتیجے میں ذہنی بے چینی اور نفسیاتی دباؤ پیدا ہو سکتا ہے، جسے کم کرنے کے لیے فرد مختلف طریقوں سے اپنے ادراکات اور رویّوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فسٹنگر کے نظریے کی روشنی میں فرد اس ذہنی تضاد کو کم کرنے کے لیے مختلف راستے اختیار کر سکتا ہے، جن میں اپنے رویے یا ادراک میں تبدیلی، نئی معلومات سے گریز، یا موجودہ رویے کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے والی فکری توجیہات شامل ہو سکتی ہیں۔ صنفی رویوں کے تناظر میں یہ عمل بعض افراد کو اپنے موجودہ تعصبات کے لیے ایسے جواز تلاش کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے جو ان کے رویے اور ان کی تعلیمی و مساوات پسندانہ شناخت کے درمیان پیدا ہونے والے تضاد کو کم کر دیں۔ لیون فسٹنگر اس نفسیاتی تضاد اور اس کے حل کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "Cognitive Dissonance theory has two basic underlying hypotheses:
> The existence of a dissonance will cause mental discomfort and motivate the individual to reduce the dissonance and restore consonance to reduce the dissonance, the individual will try to reduce it as well as avoid situations or information that are likely to increase the dissonance.
> In simple terms, a dissonance is an inconsistency in cognitive elements, which can be knowledge, opinions, beliefs, or the behaviours of an individual. The existence of such inconsistency

causes mental discomfort and motivates the individual to take some actions to reduce or eliminate it.''[9]

"معرفتی تضاد کے نظریے کے دو بنیادی مفروضے ہیں: تضاد کی موجودگی ذہنی بے چینی اور دباؤ کا باعث بنتی ہے، جو فرد کو اس تضاد کو کم کرنے اور باہمی ہم آہنگی بحال کرنے پر ابھارتی ہے۔ اس تضاد کو کم کرنے کے لیے، فرد اس میں کمی لانے کی کوشش کرتا ہے اور ساتھ ہی ان حالات یا معلومات سے بچنے کی کوشش کرتا ہے جن سے اس تضاد میں اضافے کا امکان ہو۔ سادہ الفاظ میں، معرفتی تضاد سے مراد ادراکی عناصر میں ناہمی یا عدمِ مطابقت ہے، جو کسی فرد کے علم، نظریات، عقائد یا اس کے رویوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ اس طرح کے تضاد یا عدمِ مطابقت کی موجودگی ذہنی بے چینی کا سبب بنتی ہے اور فرد کو اسے کم یا ختم کرنے کے لیے اقدام کرنے پر ابھارتی ہے۔"

یہ نفسیاتی اصول دراصل اس بنیادی الجھن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو تعلیم یافتہ طبقے کی عملی زندگی میں علم، اعتقاد اور رویے کے درمیان پیدا ہوتی ہے۔ اسی نظریاتی فریم ورک کی روشنی میں جب تعلیم اور صنفی رویوں کے اس تضاد کا جائزہ لیا جائے تو اس کے چند اہم نفسیاتی پہلو سامنے آتے ہیں:

1۔ علم اور عملی رویے کے درمیان نفسیاتی تفاوت

تعلیم یافتہ طبقے میں اس تضاد کی ایک اہم صورت اس وقت سامنے آتی ہے جب فرد کا حاصل کردہ علم اور اس کا عملی رویہ ایک دوسرے سے مختلف سمتوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم اور جدید تعلیمی اسناد رکھنے والا فرد نظریاتی، قانونی یا اخلاقی سطح پر مساوات، احترامِ انسانیت اور خواتین کے حقوق جیسے اصولوں سے واقف ہو سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود عملی زندگی میں روایتی، حاکمانہ یا صنفی تعصب پر مبنی رویوں کا اظہار کرتا ہے۔ فسٹنگر کے نظریے کی روشنی میں علم اور عملی رویے کے درمیان یہ عدمِ مطابقت فرد کے اندر نفسیاتی بے چینی پیدا کر سکتی ہے، کیونکہ ایک طرف وہ خود کو تعلیم یافتہ، روشن خیال اور مساوات پسند انسان سمجھتا ہے جبکہ دوسری طرف اس کے بعض عملی رویے ان تصورات سے مطابقت نہیں رکھتے۔

2۔ تضاد میں کمی اور فکری جواز سازی

معرفتی تضاد پیدا ہونے کے بعد فرد اسے کم کرنے کے لیے مختلف راستے اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے رویے میں تبدیلی لاتا ہے، اپنے کسی اعتقاد پر نظرِ ثانی کرتا ہے، یا ایسی معلومات اور توضیحات اختیار کرتا ہے جو اس کے موجودہ رویے اور اس کے دیگر اعتقادات کے درمیان مطابقت پیدا کر دیں۔ صنفی رویوں کے تناظر میں یہ تضاد اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب فرد اپنے موجودہ تعصب یا حاکمانہ رویے کو تبدیل کرنے کی بجائے اس کے لیے مذہبی، روایتی، ثقافتی یا خاندانی نوعیت کے جواز تلاش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، عورت کی فکری خودمختاری یا پیشہ ورانہ ترقی کے خلاف کسی رویے کو محض ذاتی تعصب کے طور پر دیکھنے کی بجائے اسے "خاندانی نظام کے تحفظ"، "روایتی اقدار" یا کسی مخصوص مذہبی تعبیر کے ذریعے قابلِ قبول قرار دیا جاتا ہے۔

3۔ ڈگری اور رویے کا تضاد: صنفی تعصب کی بقا

معرفتی تضاد کا یہ نظریہ اس مقالے کے مرکزی مسئلے کو سمجھنے کے لیے ایک اہم نفسیاتی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس نظریے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم صنفی تعصب کے خاتمے کی خودکار ضمانت نہیں بنتی بلکہ جب تعلیم یافتہ فرد کے مساوات پسندانہ تصورات اور عملی صنفی رویوں میں تضاد موجود ہوتا ہے تو وہ اس تضاد کو نفسیاتی طور پر کم کرنے کے لیے مختلف جواز اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ

تعلیم اور ڈگری فرد کو علم، معلومات اور بعض اوقات مساوات پسندانہ تصورات فراہم کر سکتی ہے، لیکن یہ چیزیں خود بخود اس کے اندر موجود تمام تعصبات کو ختم نہیں کرتیں۔ جب تعلیمی شناخت اور عملی رویے میں عدمِ مطابقت پیدا ہوتی ہے تو فرد اپنے رویے میں تبدیلی، اپنے اعتقادات پر نظرِ ثانی، متضاد معلومات سے گریز یا موجودہ رویے کے لیے فکری توجیہات اختیار کرنے کے ذریعے اس تضاد کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

جدید سماجی نفسیات میں صنفی تفریق کے مظاہر: پیٹر گلک اور سوسن فسک کا نظریہ (Ambivalent Sexism Theory)

کلاسیکی اسلامی فکر میں علم کے اخلاقی مقاصد اور تزکیۂ نفس کے مطالعے کے بعد، جدید سماجی نفسیات کے ان نظریات کا جائزہ لینا ضروری ہے جو تعلیم یافتہ طبقات میں تعصب کی دُہری اور پردہ پوش صورتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پیٹر گلک اور سوسن فسک (Peter Glick & Susan T. Fiske) نے 1996ء میں شائع ہونے والے اپنے شہرۂ آفاق تحقیقی مقالے میں یہ واضح کیا کہ تعصب محض صریح ناپسندیدگی یا نفرت کا نام نہیں، بلکہ اس کی ایک گہری اور بظاہر ہمدردانہ صورت بھی موجود ہے جو فکری تسلط کو قائم رکھتی ہے۔

گلک اور فسک اس روایاتی تقسیم اور فکری نااہلی کی توجیہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "Even though stereotypes of women contain many positive traits, the positive traits relate to social–emotional, not agentic dimensions, so women are portrayed as being nice but incompetent at many important tasks (e.g., analytical thinking)... Hostile sexism beliefs in women's incompetence at agentic tasks characterize women as unfit to wield power over economic, legal, and political institutions, whereas benevolent sexism provides a comfortable rationalization for confining women to domestic roles."[10]

> "اگرچہ عورتوں سے متعلق روایتی تصورات میں کئی مثبت خصوصیات شامل ہوتی ہیں، لیکن یہ مثبت خصوصیات سماجی و جذباتی شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ ان کی خود مختارانہ و عملی (Agentic) صلاحیتوں سے۔ چنانچہ عورتوں کو اخلاقی طور پر اچھا لیکن اہم امور (مثلاً تجزیاتی فکر) میں نااہل دکھایا جاتا ہے۔۔۔ عورت کی خود مختارانہ امور میں نااہلی کا یہ تخریبی تعصبانہ عقیدہ عورت کو معاشی، قانونی اور سیاسی اداروں میں اختیار استعمال کرنے کے نااہل قرار دیتا ہے، جبکہ بظاہر مثبت تعصب (Benevolent Sexism) عورت کو محض گھریلو کرداروں تک محدود رکھنے کے لیے ایک آرام دہ فکری توجیہ (Rationalization) فراہم کرتا ہے۔"

پیٹر گلک اور سوسن فسک کا یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ معاشرے میں عورت کی مثبت صفات کا اعتراف بھی ایک مخصوص دائرے تک محدود رکھا جاتا ہے۔ ظاہری پسندیدگی کے اس پردے میں دراصل عورت کو فیصلہ سازی اور فکری قیادت سے دور رکھنے کا نفسیاتی جواز گھڑا جاتا ہے۔ یہی وہ دوہرا معیار ہے جو جدید سماجی ساختوں میں صنفی تفریق کو ناپید کرنے کی بجائے ایک نیا رخ دیتا ہے۔

صلاحیتوں کی غیر منصفانہ تقسیم (Agentic vs. Social-Emotional Dimensions) کا علمی تجزیہ اور اسلامی تاویل

پیٹر گلک اور سوسن فسک کا یہ متن بنیادی طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ سماجی و نفسیاتی ساخت عورت کو اخلاقی اور جذباتی صفات (مثلاً نرم خوئی اور دیکھ بھال) کی حد تک تو سراہتی ہے، مگر جہاں فکری تدبر، تجزیاتی صلاحیت (Analytical Thinking) اور خود

مختارانہ فیصلے (Agentic Roles) درکار ہوتے ہیں، وہاں اسے غیر فعال یا نااہل تصور کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مشرقی اور اسلامی معاشروں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد اس نفسیاتی تقسیم کو محض نفسیاتی سطح پر برقرار نہیں رکھتا، بلکہ اس کے لیے باقاعدہ تفسیری تاویلات کا سہارا لیتا ہے۔ ڈگری ہولڈر طبقہ سورۃ النساء (آیت 34) کے لفظ "قَوَّامُون" کی تعبیر اس طرح پیش کرتا ہے گویا عورت فطری طور پر فکری و عقلی فیصلوں کی نااہل ہے اور مرد اس پر ابدی طور پر فکری حاکم ہے۔ تاہم، جیسا کہ تفسیرِ قرطبی کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔

تحفظ پسندانہ تعصب بطورِ فکری توجیہ (Comfortable Rationalization) اور مذہبی جواز سازی

گلک اور فسک کا متن مزید یہ ثابت کرتا ہے کہ تحفظ پسندانہ تعصب (Benevolent Sexism) عورت کی صریح نفی کرنے کی بجائے اسے "محترم، نازک اور مقدس" بنا کر پیش کرتا ہے، جو مردانہ حاکمیت کو یہ آسان موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ عورت کو معاشی، قانونی اور سیاسی اختیار سے دور رکھ کر صرف گھریلو دائرے تک محدود کرنے کی ایک "آرام دہ فکری توجیہ" (Comfortable Rationalization) حاصل کرے۔ درحقیقت، مشرقی اور اسلامی سیاق میں بعض افراد اس "تحفظ" کے تصور کو مذہبی اصطلاحات (مثلاً "عورت گھر کی ملکہ ہے" یا "عورت کا اصل دائرہِ کار صرف چار دیواری ہے") کے ذریعے بھی جواز فراہم کرتا ہے۔

تعلیم اور رویے کا تضاد (Education–Attitude Paradox): گلک و فسک کا نظریاتی تناظر

مجموعی طور پر گلک اور فسک کا یہ فریم ورک اس حقیقت کی نشاندہی تو بخوبی کر دیتا ہے کہ اعلیٰ اسناد رکھنے والے افراد صریح تعصب (Hostile Sexism) کی جگہ اس نرم تعصب (Benevolent Sexism) کو اپنا لیتے ہیں، لیکن یہ نظریہ اس بات کی معقول وضاحت کرنے سے قاصر رہتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود یہ رویہ قائم کیوں رہتا ہے۔ اس نقطے کی اصل تشریح لیون فسٹنگر کے Cognitive Dissonance Theory اور مقاصدِ شریعت کے باہمی ربط سے سامنے آتی ہے۔ تعلیم یافتہ مرد جب مساوات، عدل اور حقوق کا علم رکھتا ہے مگر اس کا عملی رویہ روایتی اور حاکمانہ رہتا ہے، تو اس کے اندر شدید اندرونی اور نفسیاتی بے چینی جنم لیتی ہے۔ اس بے چینی اور اخلاقی خلش کو دور کرنے کے لیے وہ اپنے رویے کو بدلنے کی بجائے دینی نصوص کی ظاہر پرستی یا روایتی تاویلات کے ذریعے اپنے عمل کو جائز ثابت کرتا ہے۔

علم اور عملی رویے کے اس تضاد کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ صنفی تعصب ہمیشہ کھلے امتیاز یا عورت کی صریح تحقیر کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات یہی تعصب احترام، تحفظ اور مدد جیسے بظاہر مثبت رویوں کے اندر پوشیدہ رہتا ہے۔ گلک اور فسک کے پیش کردہ تحفظ پسندانہ تعصب (Benevolent Sexism) کے تصور کی مزید وضاحت سے یہ سامنے آتا ہے کہ بظاہر مثبت رویوں کے اندر موجود روایتی صنفی تصورات کس طرح تعصب کو برقرار رکھتے ہیں۔

تحفظ پسندانہ تعصب: مثبت رویوں میں پوشیدہ صنفی حاکمیت

گلک اور فسک نے تحفظ پسندانہ تعصب (Benevolent Sexism) کی بنیادی تعریف اور اس کے پیچھے چھپی نفسیات کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

> "We define benevolent sexism as a set of interrelated attitudes toward women that are sexist in terms of viewing women stereotypically and in restricted roles but that are subjectively positive in feeling tone (for the perceiver) and also tend to elicit behaviors typically categorized

as prosocial (e.g., helping) or intimacy-seeking (e.g., self-disclosure). We do not consider benevolent sexism a good thing, for despite the positive feelings it may indicate for the perceiver, its underpinnings lie in traditional stereotyping and masculine dominance (e.g., the man as the provider and woman as his dependent), and its consequences are often damaging."[11]

"ہم "تحفظ پسندانہ تعصب" کی تعریف ایسے رویوں کے مجموعے کے طور پر کرتے ہیں جو بظاہر تو مثبت اور ہمدردانہ نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت میں عورت کو روایتی اور محدود دائرے میں قید رکھتے ہیں۔ جو شخص یہ رویہ رکھتا ہے، اس کے اپنے نزدیک یہ ایک اچھا اور مددگار رویہ (مثلاً معاونت یا قربت کا اظہار) ہوتا ہے۔ لیکن ہم اسے ہرگز اچھا نہیں سمجھتے، کیونکہ اس ظاہری خوش اخلاقی کے نیچے اصل سوچ وہی پرانی حاکمیت اور روایتی تصورات کی ہوتی ہے (مثلاً مرد کا خود کو کفیل اور عورت کو اپنے اوپر منحصر سمجھنا)، اور اس کے نتائج اکثر نقصان دہ ہوتے ہیں۔"

گلک اور فسک کے بیان کردہ تصور سے یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے کہ کس طرح "محبت اور تحفظ" کے نام پر عورت کی پیش رفت کو خاموشی سے محدود کر دیا جاتا ہے۔ جب ہم اپنے تعلیم یافتہ اور مسلم معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صرف ظاہری احترام یا کلامی ہمدردی جینڈر تعصب کو ختم نہیں کرتی، بلکہ اگر اس کی بنیاد عورت کو معاشی و فکری طور پر خود مختار نہ ہونے دینے پر ہو، تو یہ بھی حاکمانہ سوچ ہی کا ایک روپ ہے۔ دوسری طرف مغربی نفسیات اس غلط رویے کی نشان دہی تو کر دیتی ہے لیکن اس کا حل یا مثبت نعم البدل فراہم نہیں کر پاتی۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے اسلامی فکر ایک متوازن اور جامع حل پیش کرتی ہے۔ اسلام میں "قوامیت" یا معاشی ذمہ داری کا مقصد عورت کی صلاحیتوں کو دبانا یا اسے محتاج بنانا نہیں بلکہ ایک دوسرے کا سہارا بننا اور حقوق و فرائض کی عادلانہ تقسیم ہے۔

اخلاقی رویوں کی نفسیاتی بنیاد: مونِن اور ملر کا ماڈل

تعلیم یافتہ طبقے کے اندر پائے جانے والے پوشیدہ صنفی تعصبات کو سائنسی اور علمی بنیادوں پر سمجھنے کے لیے جدید نفسیات کے ماہرین مونِن اور ملر (Monin & Miller) کی تحقیق کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ مصنفین اس بات کی باریک بینی سے وضاحت کرتے ہیں کہ انسان کس طرح سیاسی یا سماجی دباؤ کے باوجود اپنے اندر یہ اعتماد پیدا کرتا ہے کہ اس کے متعصبانہ طرزِ عمل کو تعصب نہ سمجھا جائے، اور وہ کس طرح اخلاقی اسناد کے ذریعے اس ابہام کا سہارا لیتا ہے۔ مونِن اور ملر اس نفسیاتی میکانزم کو یوں بیان کرتے ہیں:

"One critical factor in this regard, and the focus of the present research, is the actor's confidence that his or her politically incorrect behavior can be attributed to something other than prejudice. But how do people acquire such security? We propose that one means of doing so is by establishing credentials as nonprejudiced people. For example, the more a man has shown that he is not a sexist, the less he will fear that his current behavior might be attributed to sexism and the more comfortable he will be expressing a pro-male attitude. 'Moral credentials' of this type are most available to individuals who customarily behave in a nonprejudiced fashion... Thus, they too can establish and be liberated by moral credentials."[12]

"اس حوالے سے ایک اہم عامل، اور موجودہ تحقیق کا بنیادی موضوع، یہ اعتماد ہے کہ فرد اپنے سیاسی یا سماجی طور پر نامناسب سمجھے جانے والے رویے کو تعصب کی بجائے کسی اور وجہ سے منسوب کیے جانے کا امکان سمجھتا ہے۔ لیکن انسان یہ اطمینان کیسے حاصل کرتے ہیں؟ ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ اس کا ایک ذریعہ خود کو غیر متعصب افراد کے طور پر ثابت کرنے کے لیے اخلاقی اسناد قائم کرنا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک مرد جتنا زیادہ یہ ظاہر کر چکا ہو کہ وہ صنفی تعصب کا شکار نہیں ہے، اتنا ہی کم اسے یہ خدشہ ہو گا کہ اس کے موجودہ رویے کو صنفی تعصب سے تعبیر کیا جائے گا اور اتنا ہی زیادہ اطمینان کے ساتھ وہ مردوں کے حق میں ترجیحی رویے کا اظہار کرے گا۔ اس نوعیت کی "اخلاقی اسناد" (Moral Credentials) ان افراد کو زیادہ میسر ہوتی ہیں جو عمومی طور پر غیر متعصبانہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔۔۔ چنانچہ وہ بھی اخلاقی اسناد قائم کر کے ان کے ذریعے خود کو متعصبانہ رویے کے اظہار میں ایک طرح کی آزادی محسوس کر سکتے ہیں۔"

مونون اور ملر کی اس نظریاتی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی قائم کردہ "اخلاقی اسناد" اسے ایک طرح کا نفسیاتی جواز فراہم کر دیتی ہیں، جس کی بدولت وہ اپنے بعد کے رویوں میں تعصب کو محسوس نہیں کرتا۔ اس نفسیاتی میکانزم کی سائنسی تفہیم کے بعد اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ تعلیم یافتہ اور بظاہر روشن خیال طبقے کے عمل پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقے کے صنفی رویّوں پر اخلاقی اسناد کا نفسیاتی اثر

تعلیم اور اخلاقی آگاہی انسان کے رویوں پر اثر ضرور ڈالتی ہیں، لیکن یہ ہر صورت میں تعصب کے خاتمے کی ضمانت نہیں بنتیں۔ بعض اوقات انسان اپنے سابقہ اچھے رویوں اور اپنی مثبت اخلاقی شناخت کی بنیاد پر اپنے آپ کو غیر متعصب سمجھنے لگتا ہے، جس کے نتیجے میں بعد کے متعصبانہ رویوں کو بھی وہ تعصب کے طور پر محسوس نہیں کرتا۔ مونون اور ملر کا "اخلاقی اسناد (Moral Credentials)" کا تصور اسی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مونون اور ملر کے نظریے کی روشنی میں یہ تجزیہ سامنے آتا ہے کہ فرد اپنے سابقہ غیر متعصبانہ رویوں کی بنیاد پر اپنے بارے میں ایک مثبت اخلاقی تصور قائم کر لیتا ہے۔ جب وہ خود کو منصف، غیر متعصب یا روشن خیال سمجھتا ہے تو اسے اپنے بعد کے رویے میں تعصب محسوس ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عورت کے بارے میں کسی حاکمانہ یا ترجیحی رویے کو بھی وہ تعصب کی بجائے کسی مذہبی، ثقافتی یا اخلاقی جواز سے درست سمجھ سکتا ہے۔

تعلیم یافتہ طبقے میں نادیدہ صنفی تعصب اور اخلاقی اسناد کا جائزہ

مونون اور ملر (Monin & Miller, 2001) نے اپنے نظریہ میں اس نفسیاتی کیفیت کی وضاحت کی ہے جس کے تحت انسان سماجی دباؤ کے باوجود اپنے اندر تعصب کے اظہار کے لیے نفسیاتی اطمینان اور جواز پیدا کرتا ہے۔ ان کے مطابق، جدید معاشرے میں افراد پر یہ شدید دباؤ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے تعصب سے پاک اور مساوات پسند نظر آئیں۔ اس ماحول میں فرد کے اندر یہ خواہش اور ضرورت پیدا ہوتی ہے کہ وہ یہ اعتماد اور اطمینان حاصل کر سکے کہ اس کے کسی اقدام کو تعصب یا عدمِ رواداری پر مبنی نہ سمجھا جائے۔ اس قسم کا تحفظ حاصل کرنے کا ایک بنیادی طریقہ یہ ہے کہ فرد پہلے سے اپنے طرزِ عمل سے "غیر متعصب شخص" ہونے کی ایک اخلاقی سند (Moral Credentials) قائم کرے۔ مصنفین یہ مثال دیتے ہیں کہ جب ایک مرد اپنے سابقہ طرزِ عمل سے یہ ظاہر کر چکا ہو کہ وہ صنفی تعصب (sexist) کا شکار نہیں ہے، تو اسے یہ خوف کم محسوس ہوتا ہے کہ اس کے موجودہ یا بعد کے رویے کو صنفی تعصب سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس اخلاقی سند کے نتیجے میں وہ مردوں کے حق میں ترجیحی رویے

(pro-male attitude)کا اظہار کرتے ہوئے زیادہ پر سکون محسوس کرتا ہے اور اپنے بعد کے رویوں کے اظہار میں ایک طرح کی نفسیاتی آزادی حاصل کر لیتا ہے۔

اخلاقی اسناد اور علمی عُجب: جدید نفسیات اور اسلامی فکر کا ربط

مونِن اور ملر کے "اخلاقی اسنا(Moral Credentials) "کے نظریے کا گہرا مطالعہ ایک باریک نفسیاتی حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ کس طرح انسان کی سابقہ مثبت شناخت اس کے بعد کے رویوں کے لیے ایک تحفظ بن جاتی ہے۔ جب فرد اپنے اندر یہ یقین پختہ کر لیتا ہے کہ وہ منصف اور غیر متعصب ہے، تو یہی خود مختار اخلاقی تاثر اس کے موجودہ رویوں میں پوشیدہ کھوٹ کو چھپا دیتا ہے اور اسے اپنے نادیدہ تعصبات نظر نہیں آتے۔ تعلیم یافتہ طبقے کے صنفی رویوں کے تناظر میں یہ نفسیاتی گتھی مزید واضح ہو جاتی ہے۔ علمی، اخلاقی یا دینی حیثیت کا حامل فرد اپنے رویوں کے خود تنقیدی جائزے کی بجائے اپنی اسی شناخت کو بطورِ جواز پیش کرنے لگتا ہے۔ نتیجے کے طور پر، وہ عورت سے متعلق اپنے کسی بھی حاکمانہ یا امتیازی رویے کو تعصب تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور اسے مذہبی، ثقافتی یا اخلاقی بنیادوں پر مبنی ایک منطقی اور درست عمل قرار دیتا ہے۔

علامہ ابن عاشور کی مقاصدی فکر: انسانی مساوات اور صنفی تعصب

اسلامی اخلاقیات اور مقاصدِ شریعت کی روشنی میں تعلیم یافتہ طبقے کے عملی رویوں کو سمجھنے کے لیے علامہ محمد الطاہر ابن عاشور کی فکر اہم رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ ابن عاشور نے اپنی معرکہ الآرا تفسیر "التحریر والتنویر" میں قرآنی احکام کے محض ظاہری اور فقہی الفاظ تک محدود رہنے کی بجائے ان کے باطنی مقاصد اور سماجی روح کو اجاگر کیا ہے۔ ان کی تفسیر میں یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ کس طرح انسان اپنے ماحول، روایات اور نادیدہ جاہلی اثرات کے باعث حقوق کی پامالی اور روایتی غیر مساویانہ طرزِ عمل کا شکار ہوتا ہے، اور اسے خود اس بات کا شعور یا احساس تک نہیں ہوتا۔ سورۃ النساء کی پہلی آیت کی تفسیر میں انہوں نے انسانی نوعیت کی اصل مساوات اور معاشرتی رویوں کی اس نادیدہ غفلت پر نہایت حکیمانہ گفتگو کی ہے۔ علامہ ابن عاشور رقم طراز ہیں:

> "وَوَصْلُ ﴿خَلَقَكُمْ﴾ بِصِلَةِ ﴿مِنْ نَفْسٍ واحِدَةٍ﴾ إدْماجٌ لِلتَّنْبِيهِ عَلى عَجِيبِ هَذا الخَلْقِ وَحَقِّهِ بِالاعْتِبارِ... فالمقصد الأهم منها : تقوى المؤمنين بالحذر من التساهل في حقوق الأرحام واليتامى من النساء والرجال... فإنهم قد بقيت فيهم بقية من عوائد الجاهلية لا يشعرون بها، وهي التساهل في حقوق الأرحام والايتام"[13]

> "اور[قرآن کا]﴿خَلَقَكُم﴾(تمہیں پیدا کیا) کے ساتھ﴿مِن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾(ایک ہی جان سے) کا جوڑنا ایک ایسا بلیغ مضمون ہے جو اس بات پر تنبیہ کرتا ہے کہ یہ تخلیق کتنی عجیب ہے اور کس قدر تدبر کی مستحق ہے۔۔۔ پس اس تشریع کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ اہلِ مؤمنین کو اس بات سے ڈرایا جائے اور خبردار کیا جائے کہ وہ خواتین اور مردوں کے رشتہ داروں اور یتیموں کے حقوق کی ادائیگی میں سستی اور غفلت (التساهل) سے کام نہ لیں۔۔۔ کیونکہ ان میں جاہلیت کی بعض عوائد اور رویوں کے ایسے آثار باقی رہ گئے تھے جن کا انہیں خود احساس اور شعور بھی نہیں تھا(لا يشعرون بها)، اور وہ یہی خواتین اور رشتہ داروں کے حقوق میں سستی و غفلت کا رویہ تھا۔"

ابن عاشور کی یہ وضاحت اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے کہ تعلیم اور ڈگری انسان کے عملی رویے میں انصاف اور مساوات کی لازمی ضمانت نہیں، یہی نکتہ تعلیم یافتہ طبقے میں ڈگری اور رویے کے تضاد کو واضح کرتا ہے۔

انسانی تخلیق کی یکسانیت اور مرد و عورت کی مساوات

سورۃ النساء کی پہلی آیت میں نصِ قرآنی ﴿مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾ کی مقاصدی تشریح کرتے ہوئے ابن عاشور نے یہ فکری بنیاد قائم کی ہے کہ انسانیت اپنی اصل اور تخلیق کے اعتبار سے ایک ہی اکائی ہے۔ اس قرآنی نکتہ نظر کے مطابق مرد اور عورت کے بنیادی انسانی مرتبے، عزت اور حقوق میں کسی قسم کی درجہ بندی یا برتری کی گنجائش موجود نہیں ہے۔ یہ قرآنی اصول اس مسئلہ کی ایک بنیادی حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ جب کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد عورت کو کسی بھی معاملے میں انسانی مرتبے سے کم تر سمجھتا ہے، یا اس پر بلاجواز حاکمانہ تسلط قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کا یہ رویہ نہ صرف معاشرتی ناانصافی ہے بلکہ خود قرآن کے بیان کردہ اصل انسانی مساوات کے مقصد کے بھی یکسر منافی ہے۔ اعلیٰ ڈگریاں اور تعلیمی اسناد حاصل کرنے کے باوجود اگر انسان کے اندر عورت کو ایک مساوی اور کامل انسان سمجھنے کا ظرف پیدا نہ ہو، تو یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ اس کی تعلیم اس کی عملی سوچ اور رویوں میں مطلوبہ تبدیلی پیدا نہیں کر سکی۔

نادیدہ تعصب اور جاہلی اثرات: ابن عاشور کی بصیرت

ابن عاشور کا یہ جملہ کہ انسان کے اندر بعض جاہلی عادات اور امتیازی رویے اس طرح باقی رہ جاتے ہیں کہ اسے ان کا احساس اور شعور تک نہیں ہوتا (لایشعرون بھا)، تعلیم یافتہ طبقے میں پائے جانے والے نادیدہ صنفی تعصب کو سمجھنے میں اہم رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ تعلیم یافتہ مردوں کا صنفی تعصب اکثر اوقات کھلے مخاصمانہ رویے کی صورت میں سامنے نہیں آتا، بلکہ وہ ان کی اپنی نظروں میں بھی ایک "نادیدہ تعصب" بن کر چھپا رہتا ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اسناد، سماجی مقام اور بظاہر روشن خیالی کے باوجود انسان اپنے ماحول، لاشعوری تربیت اور روایتی مردانہ تسلط کے زیرِ اثر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عملی زندگی، خاندانی فیصلوں یا اداروں میں عورت کی فکری خود مختاری محدود کرتے وقت خود کو حق بجانب سمجھتا ہے۔ وہ اپنے اس حاکمانہ رویے کو تعصب یا ناانصافی تسلیم کرنے کی بجائے روایتی سوچ کے تحت درست قرار دیتا ہے، کیونکہ اس کے اندر موجود یہ جاہلی اثرات اتنے باریک اور گہرے ہوتے ہیں کہ وہ خود بھی ان سے بے خبر رہتا ہے۔ یہاں اصل فرق یہ ہے کہ ڈگری یا تعلیمی آگاہی انسان کو نادیدہ تعصب سے خود بخود محفوظ نہیں کرتی، اس کے لیے اپنے رویوں میں موجود ناانصافی کو پہچاننا اور اس کی اصلاح کرنا بھی ضروری ہے۔

حقوق میں غفلت: ابن عاشور کا نکتہ نظر

علامہ ابن عاشور کے مطابق حقوق کی پامالی ہمیشہ کھلے انکار کی صورت میں نہیں ہوتی، بلکہ غفلت، سستی اور التساھل کے ذریعے بھی حقوق متاثر ہوتے ہیں۔ یہی صورتِ حال تعلیم یافتہ طبقے میں بھی دیکھی جا سکتی ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جب خواتین کے حقوق، ان کی فکری خود مختاری یا عملی پیش رفت کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے تو وہ عموماً کسی کھلی مخالفت یا برسرِ عام دشمنی کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کی بجائے تعلیم یافتہ فرد حقوق میں اس غفلت کو مختلف جوازوں کے ذریعے درست سمجھنے لگتا ہے۔ وہ کبھی اسے خاندانی مصلحت، کبھی ثقافتی تحفظ اور کبھی مذہبی حکمت کا نام دیتا ہے۔ یوں وہ اپنے رویے میں موجود ناانصافی کو تعصب کے طور پر دیکھنے کی بجائے اسے ایک درست اور قابلِ قبول طرزِ عمل سمجھتا رہتا ہے۔ اگر علم اور ڈگری انسان کے باطنی رویوں اور خود احتسابی کو متاثر نہ کریں، تو اعلیٰ تعلیمی و اخلاقی شناخت بھی نادیدہ تعصبات اور غیر مساوی رویوں کو پہچاننے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

ابنِ حزمؒ کے فکری نظام میں علمی عُجب کا محاکمہ

اسلامی اخلاقی فکر میں علم کے ساتھ پیدا ہونے والے عُجب کے مسئلے پر ابنِ حزم اندلسیؒ کی گفتگو بھی نہایت اہم ہے۔ انہوں نے مداواۃ النفوس و تھذیب الأخلاق میں انسان کے اخلاقی امراض اور نفس کی اصلاح پر گفتگو کرتے ہوئے علم پر عُجب سے بھی خبردار کیا ہے۔ ان کے نزدیک علم انسان کی ذاتی ملکیت یا ذاتی کمال نہیں، بلکہ اللہ تعالی کی عطا ہے۔ اس لیے علم انسان میں عاجزی اور شکر پیدا کرنے کی بجائے غرور پیدا کرے تو وہ اپنے علم کے اصل مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔ مصنف کتاب میں عُجب اور خود پسندی کے علاج پر گفتگو کرتے ہوئے، بالخصوص علم پر غرور کرنے والے شخص کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

"وَإِنْ أُعْجِبْتَ بِعِلْمِكَ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا خَصْلَةَ لَكَ فِيهِ، وَأَنَّهُ مَوْهِبَةٌ مُجَرَّدَةٌ وَهَبَكَ إِيَّاهَا رَبُّكَ تَعَالَى، فَلَا تُقَابِلْهَا بِمَا يُسْخِطُهُ، فَلَعَلَّهُ يُنْسِيكَ ذَلِكَ بِعِلَّةٍ يَمْتَحِنُكَ بِهَا، تَوَلَّدُ عَلَيْكَ نِسْيَانَ مَا قَدْ عَلِمْتَ وَحَفِظْتَ"[14]

"اور اگر تو اپنے علم پر معجب ہو جائے تو جان لے کہ اس میں تیرا اپنا کوئی کمال نہیں، بلکہ یہ محض ایک عطیہ ہے جو تیرے رب نے تجھے عطا کیا ہے۔ پس اس نعمت کا جواب ایسے عمل سے نہ دے جو اسے ناراض کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تجھے کسی ایسی بیماری کے ذریعے آزمائے جس کے نتیجے میں تو اپنے حاصل کیے اور محفوظ کیے ہوئے علم کو بھول جائے۔"

ابن حزمؒ کی اس تنبیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ علم کی فضیلت صرف اس کے حصول میں نہیں، بلکہ اس کے ساتھ انسان کے رویے میں بھی ظاہر ہونی چاہیے۔ جب علم انسان کو اپنی ذات پر فخر کی بجائے اپنی ذمہ داری کا احساس دلائے تو وہ اخلاقی کمال کا ذریعہ بنتا ہے لیکن جب یہی علم عُجب کا سبب بن جائے تو انسان اپنے علم کی حقیقت اور اس کے مقصد دونوں سے دور ہو جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر اس تصور کو تعلیم یافتہ طبقے کے رویوں کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

علمی عُجب: برتری کے عملی رویے تک

ابن حزمؒ علم کو انسان کی ذاتی بڑائی نہیں بلکہ اللہ تعالی کی عطا قرار دیتے ہیں۔ اس لیے اپنے علم پر عُجب دراصل ایسی چیز کو اپنی ذاتی فضیلت سمجھ لینا ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ جب تعلیم یافتہ فرد اپنی ڈگری، علمی حیثیت یا فکری صلاحیت کو دوسروں پر برتری جتانے کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ علم کی اسی حقیقت سے دور ہو جاتا ہے جس کی طرف ابن حزمؒ نے متوجہ کیا ہے۔ یہ رویہ صنفی تعلقات میں اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب علمی یا تعلیمی برتری عورت کو کمتر سمجھنے، اس کے فیصلوں کو غیر اہم جاننے یا اس پر اپنی حاکمیت قائم رکھنے کا ذریعہ بن جائے۔ ایسی صورت میں علم انسان کو وسعتِ نظر اور انصاف دینے کی بجائے برتری کا احساس بڑھاتا ہے اور ڈگری علمی فضیلت کی بجائے سماجی تحکم کا سہارا بن جاتی ہے۔

علم کا اخلاقی اثر: علم سے عمل تک

ابنِ حزمؒ کے نزدیک علم کا اصل تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کے عمل اور کردار میں ظاہر ہو اور اسے ایسے رویے سے بچائے جو اللہ رب العزت کی ناراضی کا باعث بنے۔ اس سے علم اور عمل کا تعلق واضح ہوتا ہے، انسان کا جاننا اپنی جگہ، لیکن اس جاننے کا اس کے کردار پر اثر پڑنا اس سے الگ اور زیادہ اہم بات ہے۔ علم اگر انسان کو اپنی اصلاح، عاجزی اور درست رویے کی طرف نہ لے جائے تو اس کی کثرت بھی اسے عُجب اور اخلاقی لغزش سے محفوظ نہیں رکھتی۔ یہی بات تعلیم یافتہ طبقے کے صنفی رویوں پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ کسی

فرد کی ڈگری یا علمی مقام یہ ثابت نہیں کرتا کہ اس نے اپنے علم کے اخلاقی تقاضوں کو بھی قبول کر لیا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ وہ عورت کے ساتھ برتاؤ میں اپنے علم کے عدل، احترام اور اخلاقی ذمہ داری کو کس حد تک عملی شکل دیتا ہے۔ اگر علمی ترقی کے باوجود عورت کی رائے کو نظر انداز کرنے، اسے فیصلہ سازی سے دور رکھنے یا اس پر غیر ضروری اختیار رکھنے کا رویہ موجود رہے، تو مسئلہ علم کی کمی کا نہیں بلکہ علم کے عملی اثر کے کمزور پڑ جانے کا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں علمی حیثیت اور عملی کردار کے درمیان موجود فاصلہ نمایاں ہوتا ہے۔

علم و عمل کا تضاد: علم کی حجیت

ابن حزمؒ کے نزدیک علم کی ذمہ داری عمل سے جڑی ہوئی ہے۔ جو شخص علم حاصل کرنے کے باوجود اس پر عمل نہیں کرتا، وہ اپنے علم کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنانے کی بجائے اسے اپنی ہی گرفت کا سبب بنا لیتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> وَتَفَكَّرْ فِي إِخْلَالِكَ بِعِلْمِكَ، وَأَنَّكَ لَا تَعْمَلُ بِمَا عَلِمْتَ مِنْهُ؛ فَلَعِلْمُكَ عَلَيْكَ حُجَّةٌ حِينَئِذٍ، وَلَقَدْ كَانَ أَسْلَمَ لَكَ لَوْ لَمْ تَكُنْ عَالِمًا[15]
>
> "اپنے علم میں اپنی کوتاہی پر غور کر کہ تو اپنے جانے ہوئے علم پر عمل نہیں کرتا، ایسی صورت میں تیرا علم ہی تیرے خلاف حجت بن جائے گا، اور اگر تو عالم نہ ہوتا تو شاید تیرے لیے زیادہ محفوظ ہوتا۔"

ابن حزمؒ کی اس تنبیہ کا تعلق صرف فرد کی ذاتی اصلاح سے نہیں، بلکہ اس سوال سے بھی ہے کہ علم انسان کے عملی رویے کو کس حد تک بدلتا ہے۔ یہی سوال تعلیم یافتہ طبقے کے علم اور عمل کے درمیان موجود فاصلے کو سمجھنے کے لیے اہم ہے۔

علم و عمل کا تضاد: علمی شناخت کا اخلاقی محاکمہ

ابن حزمؒ کی یہ تنبیہ صرف فرد کی ذاتی اصلاح تک محدود نہیں بلکہ علم اور عمل کے تعلق کی اخلاقی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ اعلیٰ ڈگریاں یا سائنسی و دینی علوم پر دسترس اس وقت تک کسی شخص کے اخلاقی کردار کی ضمانت نہیں بن سکتی جب تک اس علم کا اثر اس کے روزمرہ فیصلوں اور معاملات میں نظر نہ آئے۔ تعلیم یافتہ طبقے میں یہ تضاد اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب فرد احترام اور مساوات کے اصولوں سے واقف ہونے کے باوجود عملی زندگی میں تعصب کا مظاہرہ کرے۔ بالخصوص صنفی تعلقات میں مسئلہ معلومات کی کمی کا نہیں، بلکہ معلوم اصولوں اور عمل کے درمیان موجود فاصلے کا ہوتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ فرد جب عورت کے ساتھ حاکمانہ رویہ اختیار کرتا ہے تو اس کی ڈگری اس تضاد کو ختم نہیں کرتی بلکہ بعض اوقات اسے نظر انداز کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

بے عمل علم: اصلاح سے نفسیاتی دفاع تک

مسئلہ محض بے عملی تک محدود نہیں رہتا اس کا ایک زیادہ سنگین پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب علم اصلاح کا ذریعہ بننے کی بجائے منفی رویوں کو درست ثابت کرنے کا وسیلہ بن جائے۔ صنفی تعصبات کے معاملے میں ایک تعلیم یافتہ شخص عورت کے مساوی حقوق اور انسانی احترام سے باخبر ہونے کے باوجود جب اپنے امتیازی رویے پر سوال اٹھتے دیکھتا ہے تو وہ اپنے علم کی مدد سے اس رویے کے لیے عقلی، سماجی یا ثقافتی جواز (Justification) پیش کرنے لگتا ہے۔ یوں وہ علم جو اسے اپنی ذات کا جائزہ لینے اور خود احتسابی کی طرف لے جانا چاہیے تھا، اس کے موجودہ رویے کے دفاع کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ابن حزمؒ کی یہ تنبیہ اسی حقیقت کی طرف متوجہ

کرتی ہے کہ جس علم کا اثر انسان کے عمل پر نہ پڑے، وہ اس کے لیے فضیلت کی بجائے اس کے خلاف حجت بن سکتا ہے۔ ڈگری یا منصب کی اصل قدر تب ہے جب علم نظریاتی دعوے سے آگے بڑھ کر کردار اور رویے میں بھی نظر آئے۔

علمی ذمہ داری اور اخلاقی مسئولیت کا تفاوت

مصنف اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ایک عام انسان اگر کسی غلطی یا ناانصافی کا مرتکب ہو تو اس کی ناواقفیت اس کے لیے عذر بن سکتی ہے، لیکن علم اور بصیرت رکھنے کے باوجود وہی غلطی کرنا انسان کی عقل اور اخلاقی ذمہ داری پر سوال اٹھاتا ہے۔ ابنِ حزمؒ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَاعْلَمْ أَنَّ الْجَاهِلَ – حِينَئِذٍ – أَعْقَلُ مِنْكَ، وَأَسْلَمُ حَالاً، وَأَعْذَرُ، فَلْيَسْقُطْ عُجْبُكَ بِالْكُلِّيَّةِ"[16]

"اور جان لے کہ اس حالت میں ایک جاہل تجھ سے زیادہ عقل مند، حالت کے اعتبار سے زیادہ محفوظ اور زیادہ معذور (قابلِ عذر) ہے پس تجھے چاہیے کہ تو اپنے عُجب (غرور) کو بالکل ختم کر دے۔"

ابنِ حزمؒ کے نزدیک عقل محض معلومات رکھنے یا منطقی بات کرنے کا نام نہیں، بلکہ اس کا تعلق انسان کے فیصلوں اور رویے سے بھی ہے۔ جب ایک تعلیم یافتہ شخص علمی نظریات سے واقف ہونے کے باوجود عمل کے میدان میں ناانصافی یا تعصب کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کا علم اس کے رویے کی کمزوری کو دور نہیں کرتا۔ اس کے برعکس ایک غیر تعلیم یافتہ شخص، جس کے پاس علمی اصطلاحات اور معلومات نہیں، اگر اپنے عمل میں اس ناانصافی سے محفوظ رہے تو وہ اس تعلیم یافتہ شخص سے بہتر حالت میں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تعلیم اور اخلاقی ذمہ داری کا فرق بھی یہاں واضح ہوتا ہے۔ ایک عام جاہل فرد اگر صنفی معاملے میں حاکمانہ یا امتیازی رویہ رکھتا ہے تو اس کے پاس لاعلمی اور روایتی ماحول کا عذر موجود ہو سکتا ہے۔ لیکن جب ایک ڈگری یافتہ شخص صنفی مساوات اور انسانی احترام کے اصولوں سے واقف ہونے کے باوجود عورت کے ساتھ امتیازی رویہ اختیار کرتا ہے تو اس کے رویے کو محض لاعلمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ ان اصولوں سے واقف ہے، اس لیے اس کے عمل اور علم کے درمیان موجود تضاد زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

حاصلِ بحث

اس تحقیق کے ذریعے یہ بات سامنے آئی کہ اعلیٰ تعلیم، علمی اسناد اور دینی یا اخلاقی معلومات اپنے آپ میں انسان کو صنفی تعصب سے محفوظ نہیں کرتیں۔ علم کی اصل قدر اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ انسان کے رویے میں عدل، احترام، خود احتسابی اور دوسروں کے حقوق کی رعایت پیدا کرے۔ اگر علمی حیثیت انسان کے رویے کو بدلنے کی بجائے اسے اپنی برتری کا احساس دے دے تو علم اور عمل کے درمیان وہی فاصلہ پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار تعلیم یافتہ طبقے کے بعض صنفی رویوں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے کسی فرد کی تعلیمی قابلیت کو اس کے اخلاقی رویے کی حتمی ضمانت سمجھ لینا درست نہیں۔

تحقیق کے نفسیاتی تجزیے سے یہ بات واضح ہوئی کہ صنفی تعصب ہمیشہ عورت کی کھلی تحقیر یا صریح مخالفت کی صورت میں سامنے نہیں آتا۔ گلک اور فسک کے نظریے کی روشنی میں یہ تعصب احترام، تحفظ اور مدد جیسے بظاہر مثبت رویوں میں بھی پوشیدہ ہوتا ہے، جب یہ رویے عورت کو فکری، معاشی یا سماجی خود مختاری سے محروم رکھنے کا ذریعہ بن جائیں۔ یوں عورت کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا دعویٰ اور اسے برابر کی فکری و عملی حیثیت دینے کا عمل دو الگ چیزیں ہوتی ہیں۔ یہی فرق تحفظ پسندانہ تعصب کی اس پوشیدہ

صورت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو بظاہر نرمی رکھتی ہے مگر اپنے اندر روایتی صنفی تقسیم کو برقرار رکھتی ہے۔ اسی بحث کو فسٹنگر کے نظریۂ معرفتی تضاد اور مونوِن و ملر کے اخلاقی اسناد کے تصور سے دیکھنے پر ایک اور اہم پہلو سامنے آتا ہے کہ انسان بسا اوقات اپنے علم، اخلاقی شناخت یا سابقہ غیر متعصبانہ رویوں کی بنیاد پر اپنے بارے میں یہ اطمینان قائم کر لیتا ہے کہ وہ تعصب سے محفوظ ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے موجودہ رویے میں موجود تضاد کو محسوس کرنے کی بجائے اس کے لیے مناسب جواز تلاش کرتا ہے۔ تعلیم یافتہ فرد جب عورت کے بارے میں اپنے حاکمانہ یا امتیازی رویے کو مذہبی، ثقافتی یا اخلاقی دلیل کے ذریعے درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو فسٹنگر اور مونوِن و ملر کے نظریات کی روشنی میں اس عمل کو نفسیاتی جواز سازی کے ایک ممکنہ مظہر کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ یوں مسئلہ صرف یہ نہیں رہتا کہ فرد کیا جانتا ہے، بلکہ یہ بھی اہم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے علم کو اپنے رویے کے محاسبے کے لیے استعمال کرتا ہے یا اپنے رویے کے دفاع کے لیے۔

مجموعی طور پر تحقیق کا بنیادی نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم اور تعصب کے درمیان تعلق کو صرف ڈگری کی موجودگی یا عدم موجودگی سے نہیں سمجھا جاسکتا، اصل سوال یہ ہے کہ علم نے انسان کے اندر کیا پیدا کیا ہے۔ اگر علم انسان کو اپنے تعصبات پر نظر ڈالنے، اپنے رویے کا محاسبہ کرنے اور دوسرے انسان کے حق کو تسلیم کرنے پر آمادہ کرتا ہے تو وہ اخلاقی اصلاح کا ذریعہ بنتا ہے، لیکن اگر یہی علم انسان کو اپنی برتری پر مطمئن کر دے اور وہ اپنے رویوں کے لیے جواز تلاش کرنے لگے تو علمی حیثیت اصلاح کی بجائے تعصب کے تحفظ کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ اس لیے صنفی تعصب کے خاتمے کے لیے محض تعلیم میں اضافہ کافی نہیں علم کے ساتھ اخلاقی تربیت، تزکیۂ نفس، خود احتسابی اور عدل کا شعور بھی ضروری ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی اخلاقی فکر جدید نفسیاتی توضیحات سے آگے بڑھ کر علم کو کردار کی اصلاح سے جوڑتی ہے۔

<u>Refrences</u>

1. Al-Ghazālī, Imām Abū Ḥāmid Muḥammad, *Iḥyāʾ ʿUlūm al-Dīn*, trans. Mawlānā Nadīm al-Wājidī (Karāchī: Dār al-Ishāʿat, n.d.), 1:128.
2. Al-Ghazālī, *Iḥyāʾ ʿUlūm al-Dīn*, 1:122.
3. Al-Ājurrī, Abū Bakr Muḥammad ibn al-Ḥusayn, *Kitāb Akhlāq al-ʿUlamāʾ*, ed. Aḥmad Ḥājj Muḥammad ʿUthmān, 1st ed. (Riyadh: Dār Aḍwāʾ al-Salaf, 2007), p. 104.
4. Al-Ājurrī, *Kitāb Akhlāq al-ʿUlamāʾ*, p. 104.
5. Al-Qurṭubī, Abū ʿUmar Yūsuf ibn ʿAbd al-Barr, *Jāmiʿ Bayān al-ʿIlm wa-Faḍlih*, Bāb Āfat al-ʿIlm wa-Ghāʾilātih wa-Iḍāʿatih wa-Karāhiyat Waḍʿih ʿind Man Laysa bi-Ahlih, ed. Abū al-Ashbāl al-Zuhayrī (Cairo: Dār Ibn al-Jawzī, n.d.), 1:445, nos. 691–692.
6. Ibn ʿĀshūr, Muḥammad al-Ṭāhir, *Maqāṣid al-Sharīʿah al-Islāmiyyah*, Bāb al-Maqṣad min Aḥkām al-ʿĀʾilah (Maktabat al-Istiqāmah bi-Sūq al-ʿAṭṭārīn, 1366 AH), p. 165.
7. Nadwī, Sayyid Abū al-Ḥasan ʿAlī Ḥasanī, *Tārīkh-i Daʿwat wa-ʿAzīmat*, 1 (Lucknow: Majlis-i Taḥqīqāt wa-Nashriyāt-i Islām, n.d.), p. 178.
8. Al-Qurṭubī, Abū ʿAbd Allāh Muḥammad ibn Aḥmad, *Al-Jāmiʿ li-Aḥkām al-Qurʾān (Tafsīr al-Qurṭubī)*, 3 (Lahore: Ḍiyāʾ al-Qurʾān Publications, October 2012), p. 184.
9. Tueanrat, Yīng, and Elêftherios Alâmanos, "Cognitive Dissonance Theory: A Review," in *TheoryHub Book*, ed. Sàvvas Papâgiannîdis (2026). https://open.ncl.ac.uk. ISBN 9781739604400.

10. Glîck, Peter, and Susan T. Fiske, "The Ambivalent Sexism Inventory: Differentiating Hostile and Benevolent Sexism," *Journal of Personality and Social Psychology* 70, no. 3 (1996): 491–492.
11. Glîck and Fiske, "The Ambivalent Sexism Inventory," p. 492.
12. Mönin, Benoit, and Dale T. Miller, "Moral Credentials and the Expression of Prejudice," *Journal of Personality and Social Psychology* 81, no. 1 (2001): 34.
13. Ibn ʿĀshūr, Muḥammad al-Ṭāhir, *Tafsīr al-Taḥrīr wa-al-Tanwīr,* 4 (Tunis: Al-Dār al-Tūnisīyah li-al-Nashr, 1984), pp. 215–217.
14. Ibn Ḥazm al-Andalusī, ʿAlī ibn Aḥmad, *Mudāwāt al-Nufūs wa-Tahdhīb al-Akhlāq (al-Akhlāq wa-al-Siyar),* Faṣl fī Mudāwāt Adwāʾ al-Akhlāq al-Fāsidah, ed. Muḥammad Maṭar Āl Bāʿimr al-Kaʿbī, 5th ed. (Damascus: Dār al-Qāsim / Dār al-Qalam, 1443 AH/2022 AD), p. 149.
15. Ibn Ḥazm al-Andalusī, *Mudāwāt al-Nufūs wa-Tahdhīb al-Akhlāq (al-Akhlāq wa-al-Siyar),* p. 151.
16. Ibn Ḥazm al-Andalusī, *Mudāwāt al-Nufūs wa-Tahdhīb al-Akhlāq (al-Akhlāq wa-al-Siyar),* p. 151.